© rasailojaraid.com

ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۱، ۲، ۳، ۴ -

توافق للبقاء

مغرب کے نظریۂ ارتقاء پر ایک تعمیری تنقید

(از جناب نعیم صدیقی)

موجودہ یورپ کے مذہب "عقل پرستی" کی "الکتاب" کا ایک "مشہور سورہ" جدید نظریۂ ارتقاء ہے۔ یہ نظریہ ان بنیادی معتقدات یا اصول تہذیب میں شمار ہوتا ہے جو موجودہ سائٹی کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تائید یا تردید بڑا نجیدہ معاملہ ہے۔

جدید نظریۂ ارتقاء نے تنازع للبقاء کے تخیل کو تمدن کی جڑوں میں پیوست کر دیا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان انفرادی طبقاتی اور قومی کشمکش نہ صرف یہ کہ لازمی ہو گئی ہے بلکہ حق اور نیکی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس تصور کا عملی اثر یہ ہے کہ زندگی ایک خوفناک جہنم کی منزل پر آپہنچی ہے۔ انسان اس جہنم سے نکلنے کے لیے سخت مضطرب ہے مگر جدید انسانی شریعتوں کے معمار یہ بتاتے ہیں کہ ہم اس جہنم سے کبھی نہیں نکل سکتے کیونکہ اس کی تشکیل و تکمیل ان فطری قوانین کے ماتحت ہو رہی ہے جن کے آگے سپر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ انھیں فطری قوانین کو نظریۂ ارتقاء کے زیر عنوان جمع کیا گیا ہے۔

اب فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ ہمارے تہذیبی سفر کے جو اصول پیش کیے جا رہے ہیں آیا وہ کسی ایسی بدیہی تحقیق پر مبنی ہیں جس کی صداقت میں شبہ نہ کیا جا سکے یا یہ تحقیقات ابھی نامکمل ہے اور ابھی ارتقائے حیات کے اصولوں کی دریافت میں مزید ارتقاء کی گنجائش باقی ہے۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو پھر اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ "کاز تو اتی شد، نا چار مسلماں شو!" —— یعنی فطرت کے قہر و جبر کے آگے سر تسلیم خم کر کے اس کرہ کے اوپر ہم اپنے خون سے ہولی کھیلتے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم قدیم روما کے کسی خوفناک اکھاڑے میں اتار دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر دوسری صورت معقول ہو تو پھر ہمیں اطمینان کا سانس لینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ شاید کوئی راہ نجات نکل آئے۔ اس مضمون کا مدعا دراصل اسی امر کا تصفیہ کرنا ہے۔ ارتقائے حیات کے اصولوں کی نشاندہی میں مغربی مفکرین کے تدبر نے جو جو کوتاہیاں کی ہیں انھیں میں نے مختصر الفاظ میں پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مروجہ نظریۂ ارتقاء جسے ہم نے ایک تجربی صداقت کی حیثیت دے کر اپنے علوم کی روح بنا دیا ہے، درحقیقت ایک تجربی صداقت نہیں ہے۔

طبیعیاتی نظریہ یہ حقیقت کہ کائنات بہ حیثیت مجموعی اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ اپنی موجودہ شکل تک تدریج کے راستہ سے پہنچی ہے ایک ایسی حقیقت ہے جو سرسری مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ بادی النظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کائنات چھلانگیں نہیں لگاتی بلکہ اپنے فطری راستہ پر ایک خاص رفتار سے رینگ رہی ہے۔ اس حقیقت کو علت و معلول اور سبب و مسبب کے پیچیدہ نظم سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں دانہ مٹی میں ملتا ہے، پھر اس پر زمینی قوتیں متواتر اپنا عمل کرتی ہیں، پھر زمین سے ایک کونپل سی ابھرتی ہے، پھر حرارت، ہوا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روشنی اور پانی کے مجموعی عمل سے پر تنا ور درخت بننے لگ جاتی ہے، پھر اس پر بور آتی ہے، پھر پھول لگتے ہیں، پھر پھول کی زیریں تھیلی میں حمل قرار پاتا ہے، پھر ننھا سا بیجدان پھول کر پھل بن جاتا ہے۔ یہاں اگر بارش برستی ہے تو اس کے پیچھے اسباب و علل کا وسیع سلسلہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ سورج اپنی گرمی سے پانی کو بخارات میں بدلتا ہے، بخارات حرارت کی مدد سے کشش زمین کے خلاف حرکت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھر یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر دور دراز علاقوں میں جا پہنچتے ہیں، پھر کسی ٹھنڈی فضا میں عمل تکاثف واقع ہوتا ہے اور ننھی ننھی بوندیاں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ بارش ہو رہی ہے۔

اس سلسلۂ اسباب و علل کو اگر اور قریب سے دیکھنا ہو تو انسان کی حیات جسمانی کا مطالعہ کیجیے۔ کس طرح قوت میں انحطاط آتا ہے تو بھوک لگتی ہے، پھر کس طرح غذا کو جزو بدن بنانے کے لیے ایک پوری مشین اپنی پیچیدہ فعلیت کو استعمال کرتی ہے، پھر کس طرح از سر نو قوت پیدا ہو کر اعمال کی تشکیل میں صرف ہونے لگتی ہے۔ جسم کے نشوونما کو دیکھیے، اس کی صحت کے بگڑنے اور بحال ہونے کے اصولوں کا مطالعہ کیجیے اور اس پر بڑھاپے اور موت کے اثرات پر غور کیجیے تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہر تغیر اپنے پیچھے اسباب رکھتا ہے اور اسباب کا ظہور بالکل تدریج سے ہوتا ہے۔

سلسلۂ اسباب و علل کے جاری رہنے کے لیے تدریج ناگزیر ہے۔ چنانچہ آپ کائنات کے ہر تخریبی اور تعمیری عمل میں تدریج کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ وقت بالکل اسی طرح گزر رہا ہے جس طرح قدیم عہد کی آبی گھڑیوں میں پانی کی ایک ایک بوند ٹپکتی رہتی تھی حتیٰ کہ اوپر کے خانے کا پورا پانی نچلے خانے میں آ جاتا۔ لمحہ لمحہ کر کے ساعت بنتی ہے، ساعتیں گزرتی ہیں اور پہر بنتے ہیں۔ اسی طرح دن، ہفتے، مہینے، سال، قرن، صدیاں اور دور ایک خاص رفتار سے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہاں تدریج کا قانون بر سر عمل نہ ہوتا اور فطرت جست لگاتی ہوتی تو کائنات کی پوری داستان دو چار لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ یعنی مادہ عدم سے ایک دم وجود کی انتہائی شکل میں منتقل ہو جاتا اور اسی طرح وجود سے عدم میں اس کا انتقال بھی آنی ہوتا۔ لیکن داستان وجود بہت طویل ہے۔ اتنی طویل کہ ہم اس کے آغاز کا دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔ یہ طویل حکایت تدریج سے پیدا ہوا ہے۔

اب دوسرا مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی تدریجی حرکت ارتقائی ہے یا انحطاطی؟ سو اس سلسلہ میں محققین علوم طبیعیہ نے جتنا مواد فراہم کیا ہے وہ یہی شہادت دیتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی کارخانۂ وجود میں بناؤ کے آثار پائے جاتے ہیں اور موجودات کمال کی طرف گامزن ہیں۔ مذہب کی شہادت بھی یہی بتاتی ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا، پھر دنیا کی تعمیر شروع ہوئی اور اسی دنیا کا ایک حصہ کرۂ ارضی بھی تھا، پھر اس کرۂ ارضی میں زندگی نمودار ہوئی اور آخر کار زندگی کا کامل ترین نمونہ انسان عجائب گاہ وجود کی رونق بنا۔ جو لوگ خدا کو کارخانۂ فطرت کا موجد اور مدبر مانتے ہیں ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کی قدرت کا آرٹ ایک خاص منزل پر رکا ہوا ہے یا وہ رو بانحطاط ہے۔ ایک حکیم ہستی پر ایسا الزام لگانا انسانی فطرت سے بہت بعید ہے۔ ہمیں قرآن خود بتاتا ہے کہ صرف زمینوں اور آسمانوں کے خاندان کی تخلیق "ستۃ ایام" میں ہوئی ہے۔ (یہاں "یوم" سے مراد دور ہے)۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد زندگی کا جو کھیل رچایا گیا ہے اس پر کتنے اطوار گزرے ہوں گے۔ یہ اطوار راہ تنزل کے سنگ ہائے میل تو نہیں ہو سکتے، یہ ارتقا ہی کے مرحلے ہیں۔

بہر حال یہ حقیقت کہ کائنات منجمد نہیں بلکہ متحرک ہے اور اس کی حرکت انحطاطی نہیں بلکہ ارتقائی ہے، اسے یورپ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبیعیین، ماہرینِ طبقات الارض اور علمائے حیاتیات نے ناقابلِ انکار پایا اور اسے اپنی فکری کاوشوں کے مسلمات میں داخل کرلیا۔ لیکن اس میدان میں ان کی خوفناک ذہنی لغزش یہ تھی کہ عیسائیت کی ناروا بندشوں اور اربابِ کلیسا کی حرکتوں نے ان میں خداپرستی کے خلاف ایک متعصبانہ جذبہ پیدا کر دیا اور اسی باغیانہ انتہا پسندی کے ماتحت انھوں نے کائنات کے کارخانے کو بے خدا چلتا ہوا دکھانے کی کوشش کی۔ جوں جوں ان پر کائنات کی اس تدریجی حرکت کا انکشاف ہوتا گیا جو علت و معلول کی شاہ راہ پر اصولِ فطرت کی حدود کے متعلق جاری ہے، وہ خدا کی نفی پر مائل ہوتے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بارش برسانے کے لیے، دانہ اگانے کے لیے، زندگی کو نمو عطا کرنے کے لیے کائنات کی قوتیں بالکل کافی ہیں اور ہر مسبَّب کو اس کا طبعی سبب کسی فوق الطبیعی خارجی قوت کی مداخلت کے بغیر نمو دے رہا ہے۔ ان کے طبیعی فلسفہ کا فتویٰ یہ تھا کہ مادّہ اور قوت کا باہمی تعامل صرف وہی شکل اختیار کرتا ہے جو صحیح اور موزوں ہوتی ہے۔ یہی کائنات کی قانونیت کا راز ہے۔

آنکھیں رکھنے والا اگر نہ دیکھنا چاہے تو اسے سورج بھی دکھائی نہ دے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ ورنہ کائنات میں قانونیت کا ہونا، قوت اور مادہ کی مشین کے پیچھے ایک ہمہ گیر شعور وارادہ کی کارفرمائی کو لازمی کر دیتا ہے۔ پھر ارتقائی حرکت تو شعوریت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ تو ایک ایسا ذہن چاہتی ہے جو ارتقائی اور انحطاطی حرکت میں تمیز کر سکے اور جو ترقی کی منزلِ مطلوب اپنے سامنے رکھتا ہو۔ یہ منصب مادہ اور قوت دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔ ایک مشین جسے وجود میں لانے کے لیے مادی سامان (Material) کی اور جسے حرکت میں لانے کے لیے قوت (Energy) کی ضرورت ہے، اپنی ترتیب اور اپنی منظم حرکت کی نتیجہ خیزی کے لیے لامحالہ ایک شعور کی محتاج بھی ہے۔ پہلی دو ضرورتوں کو تو مغربی سائنس نے تسلیم کیا لیکن تیسری ضرورت سے بہت بری طرح چشم پوشی کرلی۔ یہ غلطی طبیعیات کے میدان میں ایک معمولی سی لغزش نظر آتی ہے مگر چونکہ اس کا دائرۂ اثر انسان کی تہذیبی زندگی کو محیط ہوتا ہے اس لیے پھر اس سے غلطیوں کی ایک نسل چل نکلتی ہے۔

حیاتی نظریہ مدتوں پہلے عرب مفکرین نباتات اور پرندوں کے مطالعہ سے یہ راز منکشف کر چکے تھے کہ نباتی اور حیوانی زندگی میں ارتقا کارفرما ہے۔ لیکن اس انکشاف کو ذرائع کی کمی کی وجہ سے وہ ایک مکمل علم کی حد تک نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس عظیم الشان کارنامہ کا سہرا ڈاروِن کے سر بندھا۔ اس نے نباتات، کیڑوں مکوڑوں، دریائی جانوروں، تتلیوں اور دوسرے پرندوں کے مطالعہ و مشاہدہ سے حیوانی ارتقاء کے تصور کو مکمل کیا۔ اور ان عوامل کی نشان دہی کی ایک ابتدائی کوشش کی جن کے ماتحت یہ ارتقاء واقع ہو رہا ہے۔ جہاں تک نفسِ ارتقا کے دعویٰ کا تعلق ہے، ڈاروِن سے اختلاف کرنا مشکل ہے، لیکن اس نے اپنے نظریہ کی جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ پوری کی پوری قابلِ قبول نہیں ہیں۔

علاوہ بناتاتی زندگی کی طرح حیوانی زندگی کے ایک ہی نقطۂ آغاز "احیا" کا قائل ہے۔ اسی خیال کی تشریح اس نے "اصل الانواع" میں کی ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ علم الحیات کا خاکہ تو بنا ہے مشاہدہ سے مگر اس کو مکمل کرنے کے لیے رنگ آمیزی کی گئی ہے قیاس سے۔ مشاہدہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ تو ناقابلِ انکار ہے مگر قیاس کی ستم ظریفیاں چون و چرا کی کافی گنجائش اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ دعویٰ محض قیاسی ہے کہ زندگی نے واحد نقطۂ آغاز سے حرکت شروع کی تھی۔ آخر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کی اولین نمود کے لیے کرۂ ارضی پر صرف ایک ہی مقام پر حالات سازگار ہوئے تھے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اسے مختلف مقامات سے شروع ہونا چاہیے۔ اس صورت میں اس کے ابتدائی ظہور کی شکل کو ہر ماحول میں یکساں ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود ڈاروِن اور اس کے متبعین اختلافِ ماحول کو حیاتی و عضویاتی اختلافات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ایک نہایت قوی سبب مانتے ہیں۔ پھر اگر مختلف حالات اور مقامات سے مختلف پیرایوں میں زندگی کے ظہور کو مان لیا جائے، تو "اصل الانواع" کا سارا فلسفہ باطل ہو جاتا ہے۔

پھر حیات کی حرکت کو جاری رکھنے والے معروف اصول بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کی جو تشریح پیش کی گئی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی اپنی ادنیٰ اشکال کو کچلتی اور روندتی ہوئی کسی اعلیٰ شکل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس موقع پر وہ مشہور سوال پیدا ہوتا ہے جسے حامیانِ ارتقا اب تک حل نہیں کر سکے ہیں کہ زندگی کی بعض بالکل ابتدائی اشکال آج تک کیوں کرۂ ارضی پر باقی ہیں، مثلاً مچھلیاں، مینڈک وغیرہ حتیٰ کہ زندگی کا پہلا ڈیزائن یعنی "امیبا" بھی نہیں مٹ سکا۔ زندگی نے جب انسان جیسا اعلیٰ مظہر فراہم کر لیا ہے تو اس کے ساتھ یہ ادنیٰ حیوانات کیوں چلے جا رہے ہیں؟ اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو ادنیٰ حیوانات ابھی تک چلے جا رہے ہیں انھوں نے ماحول کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہے۔ مگر اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو حیوانات دنیا سے ناپید ہو گئے ہیں وہ کیوں نہ ماحول سے موافقت پیدا کر سکے؟ آخر ماحول سے موافقت پیدا کرنے یا نہ کرنے کی ذمہ داری براہ راست وجود پر تو ہے نہیں، اس کا انحصار تو بہر حال فطرت پر ہے، تو براہ کرم یہ بتائیے کہ کونسا قانون تھا جس کے ماتحت مینڈک سلامت رہا اور سیمرغ ناپید ہو گیا؟ اس کی جسامت کن اسباب کے ماتحت کم نہ ہو سکی؟ اس کا معدہ کن اصولوں کے زیر اثر سکڑ نہ سکا؟ وہ دشمن سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بہتر اعضا کیوں فراہم نہ کر سکا؟

اور آگے چلیے، حیات کا ارتقائی عمل جن اصولوں پر واقع ہوتا ہے وہ جوں کے توں ہیں اور حیات کی بالکل ابتدائی اشکال بھی موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ارتقا کی راہ پر ایک ہی قافلہ انسانیت کی منزل تک پہنچ کر رہ گیا، اس کے بعد کوئی دوسرا قافلہ آگے نہ بڑھا؟ حالانکہ قانونِ ارتقا کی رو سے تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے قافلہ کے بعد بے شمار قافلے حیوانیت کی سرحد سے انسانیت کے حدود میں پے در پے داخل ہوتے چلے جاتے اور شاہراہِ ارتقا کی ہر منزل پر ہم ایک نہ ایک قافلے کو بالفعل موجود پاتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوّل تو بیچ کی منزلوں پر بکثرت کڑیاں غائب ہیں جن کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی، دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے پانچ ہزار برس کے دوران میں جس کا تاریخی و اثری ریکارڈ محفوظ ہے، انسان صرف انسانی نطفے ہی سے پیدا ہوتے رہے ہیں، نچلے طبقاتی حیوانوں میں سے کوئی ابھرتی نوع انسانی کو نہیں ملی۔

یہ ایک نہایت قوی اعتراض ہے جس کا کوئی معقول جواب ڈارونی نظریہ کے پیرو نہیں دے سکے ہیں۔ بااوقات وہ کہتے ہیں کہ ارتقا کی راہ پر یکے بعد دیگرے قافلے چلے آ رہے ہیں، یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے، اور اس کے ثبوت میں "بن مانس" پیش کیے جاتے ہیں کہ یہ ہمارے پیچھے ایک قریب ترین قافلہ ہے جو منزل سے نزدیک آ پہنچا ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر "گمشدہ کڑیوں" کا مطلب کیا قرار پائے گا؟ عقیدۂ ارتقا کا کوئی علمبردار بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ زندگی کی تمام اشکال ا سے ی تک موجود ہیں۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ سلسلۂ وجود کی بعض کڑیاں ناپید ہیں اور اس سے ان کے نظریہ پر جو نقص وارد ہوتا ہے اسے دفع کرنے کے لیے وہ فرض کر لیتے ہیں کہ حیات کی فلاں فلاں قسم کی فلاں فلاں صفات رکھنے والی بعض اشکال "تنازع للبقاء" کے معرکے میں شہید ہو گئی ہیں، یعنی اگرچہ وہ آج موجود نہیں ہیں، مگر وہ کبھی نہ کبھی تھیں ضرور۔[1] ان کے اس بیان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم انسان ارتقا کی جو راہ طے کر کے موجودہ منزل تک پہنچے ہیں اس

[1] ان کے اس قول کو ہم "مفروضہ" سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ انھوں نے آج تک اس بات کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ جن کڑیوں کو (باقی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جا بجا بڑے بڑے غار پڑ گئے ہیں اور گمشدہ کڑیوں نے اس تسلسل کا خاتمہ کر دیا ہے جو حیات کے ارتقائی سفر میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر کوئی قافلہ اس تباہ شدہ راستے پر کیسے بڑھ سکتا ہے؟

اب اگر مزید قافلوں کی رو ارد مسدود ہے تو لازماً اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان تک پہنچنے کے بعد زندگی کی ارتقائی حرکت بند ہو چکی ہے۔ اور جب عمل ارتقاء جاری نہیں ہے تو تنازع للبقاء کے کیا معنی؟ اور بعض بہت ترقی یافتہ شکلوں کے مفقود ہو جانے کے بعد بعض ادنیٰ اشکال حیات کے باقی رہ جانے کی کیا وجہ؟

اوپر کی سطور سے غالباً یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ڈارون کا نظریہ مشاہدات اور قیاسات کا مخلوطہ ہے لہٰذا اس کی حیثیت ایک تجربی صداقت یا ایک ثابت شدہ حقیقت کی نہیں ہے۔ مگر اس کو جب فروغ حاصل ہوا تو علمائے یورپ نے اسے ایک امر واقعی کی طرح ناقابل تردید مان کر اس کی بنیاد پر علوم کی تدوین شروع کر دی۔ پھر ان علوم پر نظام زندگی کی جو عمارت کھڑی کی گئی وہ انسانیت کی آسائش گاہ بننے کے بجائے آدم کشی کے لیے ایک اچھا مقتل ثابت ہوئی۔

جس طرح علمائے طبیعیات نے خدا کے انکار کو فکر کا نقطۂ آغاز بنایا اسی طرح ڈارون اور اس کے متبعین نے حیاتیات کے کلیسا کو خدا سے خالی کر کے فلسفۂ حیات کی تعمیر شروع کی، حالانکہ اس غلط طرز فکر سے بعض ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا سلجھانا کار دشوار ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ طبیعی عناصر کے اندر مقام شعور کی طرف بڑھنے کا رجحان کہاں سے آیا اور اس کے لیے ایک ایسی شاہراہ کے مراحل کس نے تجویز کیے جو طے کیے جانے سے پہلے موجود نہیں تھی؟ "اصلحیت" کا معیار کس کے پاس تھا جو اعلیٰ کو ادنیٰ سے چھانٹتا جا رہا تھا؟ ایک حیوان نئے ماحول کے تقاضوں سے جب دوچار ہوتا تھا تو کون تھا جو اس میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس کرتا تھا اور کون تھا جو اس ضرورت کو پورا کرتا تھا؟ اور کس نے ارتقاء کے لیے "تنازع للبقاء" کا قانون بنایا جس پر جانداروں کی نسلوں کی نسلیں بھینٹ چڑھ گئیں؟ — "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔ مگر اس معشوق کا انکار کر کے یورپ کی حکمت اس پردۂ زنگاری ہی کو معشوق بنا بیٹھی۔

اس نظریہ کا نمایاں ترین اثر انسانی ذہنیت پر یہ پڑا کہ انسان کو انسان سمجھ کر غور کرنے کے بجائے اسے حیوان فرض کر کے مختلف سیاسی، معاشی اور اخلاقی سوال حل کرنے شروع کر دیے گئے۔ جہاں کوئی پیچیدگی تمدن میں پیدا ہوئی ماہرین فنون نے پلٹ کر انسان کے نو دریافت شدہ "اسلاف" کی زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا اور جو اصول حیوانی زندگی میں کارفرما دیکھے انھیں جوں کا توں لا کر انسانی زندگی پر چسپاں کر دیا۔ اس طرح ہوتے ہوتے "تہذیبی ارتقاء" کا ایک عظیم الشان فلسفہ مدون ہوا جس کے اصول نئی انسانی دنیا کے اساسی معتقدات میں شمار ہوتے ہیں اور جن کے اثبات میں انتہائی تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔

تہذیبی نظریہ اور اس کا ارتقاء یورپ میں جاگیرداری نظام کی جانشینی کے لیے جس دن مشینی دور نے جنم لیا تھا، شاید دنیا کے لیے اس سے بڑا منحوس دن کوئی نہ آیا ہوگا۔ اسی دور میں سائنس نے انسان کو نو بنو قوتیں مسخر کر دیں اور مشین نام کے آہنی دیو کو تہذیب انسانی کے قصر زریں میں تخت استبداد پر بٹھا دیا۔ مشین جو خدا کا ایک عظیم الشان انعام تھی، اس کی سرعت عمل اور کثرت

(بقیہ) وہ مفقود قرار دیتے ہیں وہ فی الواقع کبھی پائی جاتی تھیں، بلکہ دراصل اپنے نظریہ کو سائنٹفک حیثیت سے قائم کرنے کے لیے انھوں نے فرض کر لیا ہے کہ یہ کڑیاں کبھی ضرور پائی جاتی ہوں گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کارگذاری مذہب کے غلط نظام کی وجہ سے انسانی تمدن کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گئی۔ اس کا پہلا حملہ دستی صناع پر ہوا کیونکہ مشین سے کام لینے کے لیے سرمایہ درکار تھا اور اس سے کاریگر محروم تھا۔ وہ بیچارا "عقل کا پورا" "گرگانٹھ کا کورا" تھا۔ مشین صرف سرمایہ دار کے حبالۂ عقد میں آسکتی تھی۔ چنانچہ اونچے طبقے کے لوگوں نے کارخانے کھول لیے اور صناع ان کے پاس مزدور بن کر کام کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان کی مجبوری کی وجہ یہ تھی کہ مشینی مصنوعات پر وقت اور انسانی قوت کا صرفہ بمقابلہ دستی مصنوعات کے بہت ہی کم آتا تھا اور اسی وجہ سے ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ جوں جوں مشینیں بڑھتی گئیں صناع طبقہ کارخانوں میں جمع ہوتا گیا۔ ان کی مجبوری سے فائدہ یوں اٹھایا گیا کہ مشینی کثیر پیداوری سے جو غیر معمولی منفعت ہوتی تھی وہ تو سرمایہ دار کی تجوری کا پیٹ بھرنے کے لیے وقف ہوگئی اور کارکنوں کو صرف اتنا معاوضہ دینا کافی سمجھا گیا جس کے بل پر وہ کسی طرح جیے جائیں اور صنعت کے "کولھو" کو چلاتے رہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے معاوضے بہت قلیل رکھے گئے بلکہ ان کے اوقات کارکردگی کو بڑھانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ نوبت بایں جارسید" کہ ایک خاندان کے پورے افراد کمانے پر مجبور ہوگئے۔ حتیٰ کہ عورتوں کو گھر کی چاردیواری سے نکلنا پڑا اور نابالغ بچوں کو بھی کارخانہ داروں کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ پیٹ پالنا ہی کیا کم مشکل تھا کہ کارخانوں کی کیمیاوی فضا اور کثرت کار اور عالم طفلی کی محنت نے ل جل کر مزدور طبقہ کی صحتوں کو انتہائی طور پر گرا دیا۔ ہوتے ہوتے سوسائٹی مستقلاً معاشی نقطۂ نظر سے ظالم و مظلوم دو طبقوں میں بٹ گئی۔

سوال یہ ہے کہ یہ حالت پیدا کیسے ہوگئی تھی؟ کیوں نہ طبقہ وارانہ مظالم کی بروقت روک تھام کی گئی؟ اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ مشینی دور جمہوریت کو بھی ساتھ لایا تھا جس نے سرمایہ دار طبقہ کو حکومت کی مشینری پر پورا قبضہ دے دیا تھا اور یہ قبضہ کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ لٹیرے خود ہی حاکم بھی تھے اور لٹنے والے انہی کے آگے فریاد کرنے پر مجبور تھے۔ یہ فرماں روا جو قانون بناتے تھے اس کا مقصد لوٹ کھسوٹ میں مزید سہولتیں پیدا کرنا اور کمزوروں کا خون چوسنے کے حق کی حفاظت کرنا تھا۔ انہیں لٹنے والوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ہمدردی اور انسانی ذمہ داریوں کے احساس کا ایک محرک مذہب ہو سکتا تھا، سوا سے پادری پہلے ہی دربار کر چکے تھے اور اس کے رہے سہے اقتدار کو جدید سائنٹفک تحریک نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے لیے جس انفرادی آزادی کا صور اٹھارویں صدی میں پھونکا گیا تھا اس نے ہر فرد کو کھلا لائسنس دے دیا تھا کہ اپنی قابلیت، ہوشیاری اور ذرائع و وسائل سے جس طرح چاہے اپنے مفاد کو ترقی دے اور اپنے حوصلے اور اپنی خواہشات پوری کرے قطع نظر اس سے کہ سوسائٹی پر اس کی خود غرضی کا کیا اثر مترتب ہو۔ معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق، غرض ہر شعبۂ زندگی میں اس آزادی کو فرد کا بنیادی حق قرار دے دیا گیا اور تمام قوانین اس اصول پر بنائے گئے کہ افراد کے اس "حق" کی لازماً حفاظت کی جائے۔

مشین اور سرمایہ داری کے اس گٹھ بندھن کا نتیجہ صرف یہی نہ نکلا کہ مغربی ممالک میں سے ہر ملک کا مال دار طبقہ خود اپنے ملک کے غریب طبقوں کے لیے خون آشام بن گیا، بلکہ مزید براں اسی چیز نے جدید امپیریلزم کو بھی جنم دیا۔ مشین کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کم آدمیوں کی محنت سے بہت مال پیدا کرتی ہے اور ملک کے کثیر التعداد باشندوں کو بے کار کر دیتی ہے۔ اب اگر ایک ملک جو مشینی صنعت کا طریقہ اختیار کر چکا ہو، اپنے تمام باشندوں کو برسر کار رکھے تو وہ اتنا زیادہ مال بنائے گا جو کسی طرح خود اس ملک میں نہیں کھپ سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیاں پیدا کرے اور اس کے ساتھ اس امر کی کوشش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی کرے کہ نہ تو خود اُن ملکوں میں مشینی صنعت کا طریقہ رائج ہونے پائے اور نہ وہاں کسی دوسرے ملک کا مال کھپ سکے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف پوری دنیا ظالم ملکوں اور مظلوم ملکوں میں تقسیم ہو گئی اور دوسری طرف خود ظالم ملکوں میں بھی دائمی رقابت اور جنگ کی بنا پڑ گئی۔

مگر اس کشمکش اور اس معاشی لوٹ کا فائدہ جو کچھ بھی ہوا ظالم ملکوں کے محض سرمایہ دار طبقوں ہی کو ہوا، نادار طبقوں کے لیے اس میں کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ ان کی ناداری اور بڑھتی چلی گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اقتضا ہی یہی ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جائے۔ اس عمل کا سلسلہ جب ایک عرصہ تک جاری رہا تو طبقاتی ناہمواری ناقابلِ برداشت سی ہو گئی۔ اب عیاشی اور فاقہ کشی کا بڑھتا ہوا فرق کھٹکنے لگا۔ اسی دوران میں اعداد و شمار سے نتائج اخذ کرنے کا فن پھیل رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے طبقہ وارانہ شرحِ اموات اور شرحِ بیماری کو نمایاں کیا۔ جرائم کی تحقیقات کرنے والی کمیٹیوں نے عدالتوں کے ریکارڈ سے جرائم کی رفتار اور اس کے معاشی محرکات کو اجاگر کیا، آخر کار علماء کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ یہ خلافِ انسانیت حالات کیوں پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن مسئلہ جتنا افسوس ناک تھا اس سے زیادہ افسوس ناک وہ حل نکلا جو مغربی ذہن نے تلاش کیا۔ سیدھی صاف بات تھی کہ دنیا اور اس کی متاعات کو لاوارث مال سمجھنے اور معیشت کو انفرادی معاملہ قرار دے کر آدمی کو کمانے اور کھانے میں بے لگام بنا دینے کا لازمہ یہ تھا کہ انسان انتہا درجہ کی خود غرضی سے کام لے اور اپنی زندگی کو ایک طبعی حادثہ سمجھتے ہوئے کسی اونچے مقصد سے بے نیاز ہو کر زیادہ سے زیادہ لذت و لطف حاصل کرنے میں لگ جائے، خواہ اس لطف و لذت کی قیمت میں اسے اپنے ابنائے نوع کا خون ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ جب خدا ناشناسی نے اسے اخلاقی ہستی سے گرا کر محض ایک معاشی جانور بنا دیا تھا تو پھر وہ اپنے پیٹ اور اپنے جذبات جنسی کے مقابلہ میں ابنائے نوع کا کیا پاس کر سکتا تھا۔ مگر اس سیدھی بات کو علمائے مغرب نہ پا سکے۔

عضویاتی زندگی نظریۂ ارتقاء کی لپیٹ میں پہلے ہی آ چکی تھی۔ اس کے ساتھ تمام مسائلِ زندگی کو ایک ہی اصول سے حل کرنے کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ پس علمائے عمرانیات نے اپنے عقلی تمدن کے حق میں پوری فرنفتگی کے ساتھ یہ فتویٰ دے دیا کہ سوسائٹی عین انھیں فطری اصولوں پر ارتقاء کر رہی ہے جو عضویاتی زندگی میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں بھی تنازع للبقاء کا قانون اسی طرح برسرِ عمل ہے جیسے بے جان مادہ سے لے کر حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی زندگی ناقص اور کمزور افراد، طبقات اور اقوام کو پیچھے پھینکتی اور قوی و اصلح افراد، طبقات اور اقوام کو آگے بڑھاتی جا رہی ہے اور یہی ارتقاء کی شاہ راہ ہے۔

خدا ناشناسی کے فطری نتیجہ کے طور پر جو "غیر فطری" حالت پیدا ہو گئی تھی اسے ان لوگوں نے فطری قرار دے کر اتنا بڑا ظلم کیا کہ اس پر انسانیت صدیوں تک ماتم کرتی رہے گی۔ مدنیاتِ جدیدہ نے سرمایہ دار طبقہ اور امپیریلسٹ قوام کو تو اصلحیت کی سند دے کر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور مزدور طبقہ اور محکوم اقوام کو یہ سبق پڑھایا کہ یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو بالکل فطری ہے۔ تم اگر پس رہے ہو تو تمھارا حق یہی تھا کہ پسو۔ انسان اپنے ابنائے نوع سے مستقلاً برسرِ جنگ رہنے پر مجبور ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ یا وہ ظالم طبقہ میں شامل ہو یا مظلوم گروہ میں۔ ان دو حالتوں کے سوا کوئی تیسری فطری حالت ممکن ہی نہیں ہے۔ فرد بہر حال افراد سے، خاندان خاندانوں سے، پارٹی پارٹیوں سے اور قوم قوموں سے اضطراراً متصادم ہے اور اس تصادم میں کمزور کا مٹ جانا ہی ارتقائے حیات کا مقتضا ہے۔ اندھی مشیت کی یہ حیثیت اٹل ہے اور اس کا مقابلہ ناممکن!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تخیل ایسا تھا کہ اس نے میدان میں آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے تو ان تمام لوگوں کی زبانیں بند کر دیں جو تمدن جدید کی ناہمواریوں پر بگڑ بگڑ رہے تھے۔ یہ جو احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ہم نے زندگی کے نظام کی ترتیب و تنصیب میں کوئی غلطی کر دی ہے، ایک قلیل عرصے میں خودکشی کر گیا۔ طبقاتی اور قومی امپیریلزم نے اس نظریہ کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کی معاشی و سیاسی جلادی کو فطری نیکی قرار دے رہا تھا۔

اگلا قدم | یہاں تک کی علمی کاوشوں نے محکوم اقوام اور مزدور طبقہ دونوں کو فطرت کی جبریت کے پنجہ میں بے بس چھوڑ دیا تھا، لیکن بعد کے علماء نے ایک قدم آگے بڑھا کر مزدور طبقہ کو ایک نئی راہ نجات دکھائی اور وہ یہ تھی کہ تم قوت پیدا کر کے "بقائے اصلح" کے قانون کا تقاضا پورا کر دو تو اس آسمان کے نیچے تمہیں بھی کبریائی کا منصب مل سکتا ہے۔ سوسائٹی خاندان نہیں ہے کہ اس کے افراد آپس میں تعاون کے ساتھ جئیں بلکہ یہ پیدائشی دشمنوں کا ایک مجمع ہے جس کے اجزائے ترکیبی کے لیے قانونِ فطرت یہی ہے کہ ہر ایک دوسروں کو بھون کر کھانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہاں شریف بن کر رہو گے تو گھاٹے میں رہو گے اور اگر شرافتِ انسانی کی قبا اتار کر نزاع و مقابلہ میں مشغول ہو جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تاریخ کا جدلی فلسفہ مرتب ہوا۔ جدل و پیکار ارتقاء کی شاہراہ ٹھیری اور ہر بڑی خوں ریزی زندگی کے رہوار کے لیے ایک تازیانہ قرار پائی۔

اب نئے فلسفۂ اخلاق نے یہ اپدیش دینا شروع کیا کہ لذت اندوزی سب سے بڑی نیکی ہے اور سوسائٹی کی خاطر اپنی خواہشات پر کوئی روک لگانا ایک ایسا گناہ ہے جس کی تلافی کبھی ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ زندگی اسی کرہ پر ختم ہو جانے والی ہے۔ سیاست کا مذہب یہ قرار پایا کہ حکومت پر جو گروہ قابض ہو جائے وہ اپنی اصلحیت کی وجہ سے بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ قانون کے رولر سے انسانوں کو کچلتا پھرے۔ نیم مہذب اور نئے اسلحہ سے محروم اقوام پر ترقی یافتہ اقوام کا اپنی خدائی مسلط کرنا ان کا فطری حق ہے۔ معاشیات کے فلسفہ کی پکار یہ تھی کہ دنیا ایک ایسا خوانِ نعمت ہے جو محض خوش اتفاقی سے انسان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کی نعمتوں سے حصہ وافر پانے کے لیے جہاں تک ممکن ہو دست درازی سے کام لیا جائے۔ کسی کا حصہ مقرر نہیں ہے اور کسی کے لیے حصہ کی تحدید نہیں ہے۔ اس دسترخوان کے استعمال کا کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں ہے۔ مزے سے اپنے سامنے کی کشتی سے بھی تر مال اڑاؤ اور ہو سکے تو دوسروں کی رکابیوں کو بھی خپٹ کر جاؤ بلکہ اگر کسی کے منہ سے نوالہ چھین لو تو یہ بہت بڑی اصلحیت ہے اور اگر پیٹ میں نقب لگا کر معدہ سے غذا نکال لاؤ تو پھر تو کمال صلاحیت کے کہنے ہی کیا ہیں اور اگر بنا بنایا خون چوس سکو تو انسانیت تمہاری "ذو فطرتی" پر ترنوں فخر کرتی رہے گی۔

یہ نظریات تھے جنھوں نے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو جہنم زار بنا دیا اور جدلی فلسفۂ تاریخ کے ماتحت اسی نظام کے پیٹ سے وہ نظام برآمد ہوا جسے آج کمیونزم کے نام سے ہر تعلیم یافتہ شخص پہچانتا ہے اور جس نے سرمایہ داری کی قہرمانیوں کا جواب مزدور کی خونی ڈکٹیٹر شپ سے دے کر نظریۂ ارتقاء کے صداقت نامہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

مختصر یہ کہ اس سماجی نظریۂ ارتقاء نے حسب ذیل اصول پیش کیے ہیں:۔

(۱) جو قانونِ ارتقاء بے جان مادّے کی حرکت میں پایا جاتا ہے اور جو عالم حیوانات میں اور خود انسان کی عضویاتی زندگی میں جاری ہے وہی تہذیب و تمدن کی حرکت میں بھی کار فرما ہے۔

(۲) تہذیبی ارتقاء غیر منقطع تسلسل کے ساتھ اور انسان کی شعوری خواہش کے بغیر ہو رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) اس ارتقاء کی شاہ راہ "تنازع للبقاء" ہے جو نہ صرف انسان اور طبیعی توانین کے درمیان جاری ہے بلکہ خود نوعِ انسانی کے اندر قوموں اور افراد کے اندر بھی جاری ہے۔

(۴) تنازع للبقاء کا فطری اصول ہم پر بہ جبر نافذ ہے اور ہم اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رکھتے۔

آئیے اب ذرا ان اصولوں کو پرکھ لیں۔

کیا تہذیب اِرتقا کر رہی ہے

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عضویاتی زندگی میں فی الواقع ڈارونی تصور کے مطابق قانونِ ارتقاء کام کر رہا ہے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ انسان کی عضویاتی اور تہذیبی و اخلاقی زندگی میں ایک بہت بڑا فرق ہے جس کے ہوتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا اور دونوں پر ایک ہی قسم کے اصولوں کا عملدرآمد تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ آپ اگر زہر کھالیں اور پھر یہ چاہیں کہ آپ کا معدہ اس زہر کے کسی اثر کو آپ کے نظامِ جسمانی پر مترتب نہ ہونے دے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ کے کان کھلے ہوئے ہوں اور کوئی خارجی آواز آپ کے دماغ پر اثر انداز بھی نہ ہو یا آپ کی آنکھ بند رہے اور آپ اپنے گرد و پیش کے موجودات اور ان کی حرکات کو دیکھتے جائیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اگر آپ یہ چاہیں کہ آپ اپنی قوت کو صرف تو کرتے رہیں لیکن اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جسم بھوک کی شکل میں اپنا "بل" نہ پیش کرے اور آپ یہ بل دیدہ و دانستہ ادا نہ کریں تو ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ کتنی ٹھوس قانونیت ہے جس کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں خود غرضی کا داؤں نہیں چلتا۔ یہاں آپ فطرت کے مطالبات سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ مگر یہی زندگی کے ایک دوسرے میدان میں آپ کی حیثیت کچھ اور ہے۔ مثلاً آپ جاتے ہیں اور اپنے دوست کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرہ بالکل خالی پڑا ہے اور اتفاق سے میز پر آپکے دوست کا پارکر پن پڑا ہوا ہے۔ اسے اگر آپ اٹھا کر اُلٹے پاؤں لوٹ جائیں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے اور اس فعل سے آپ پر کوئی بُرا اثر بظاہر مترتب نہیں ہوتا ہے۔ فرمائیے، اب آپ پورے اختیار کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ایک دوراہا آپ کے سامنے کھلا پڑا ہے اور انتخاب کا پورا حق آپ کو حاصل ہے۔ کوئی خارجی قوت آپ کو عمل کی کسی منفی یا مثبت شکل پر مجبور نہیں کرتی۔ یہاں فطرت کی غیر متغیر اور بے لچک قانونیت مفقود ہے۔ ان دو قسمی مثالوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف مجبوری کا مقام ہے جہاں صحیح اور غلط کا تصور تو ہے مگر نیکی اور بدی کا نہیں۔ دوسری طرف مختاری کا منصب ہے جہاں نیکی اور بدی کا تصور کام کرتا ہے۔

دراصل آدمی کی زندگی مختلف مظاہرِ حیات کے خواص کی جامع ہے اور پھر ان خواص سے اوپر اپنے کچھ امتیازات بھی رکھتی ہے جن لوگوں نے اسے خاندانِ موجودات کا معمولی فرد قرار دیا ہے انھوں نے اس کی اصلیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ آدمی کا جسم چونکہ مادی عناصر سے بنا ہے لہٰذا ایک حد تک اس پر طبیعاتی قوانین کا سکہ بھی رواں ہے۔ پھر اس کے اندر نشو و نما اور نظامِ تغذیہ پایا جاتا ہے لہٰذا اس پر عالمِ نباتات کے قواعد بھی نافذ العمل ہیں۔ پھر وہ نفس یعنی احساس اور قوتِ ارادی رکھتا ہے اس وجہ سے اس پر ان قوانین کی حکومت بھی ہے جو حیوانات کی زندگی میں کارفرما ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے علاوہ وہ ترکِ اختیار کی قوت اور اخلاقی ذمہ داری کا منصب اور مدنیت کا زور دار جذبہ بھی رکھتا ہے، لہٰذا وہ کچھ اخلاقی قوانین بھی چاہتا ہے۔ حیاتِ انسانی کی اسی آخری خصوصیت کو موجودہ عمرانی فلسفوں نے ساقط النظر رکھا ہے اور اسے دوسرے پہلوؤں کے نیچے چھپا دیا ہے۔ انسان اپنی اس خصوصیت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قطعاً منفرد ہے اور اس پہلو سے جب ہم اس کے لیے زندگی کے اصول تلاش کرنا چاہیں تو خاندان حیات کے دوسرے افراد کی زندگیوں کا مطالعہ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرتا ہے۔

جہاں تک طبیعیاتی قوانین کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی خارجی قوت کے بل پر بہ جبر کائنات میں نافذ ہیں اور ان سے بغاوت کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ نباتاتی ضابطۂ فطرت بھی نباتات کی مرضی سے نہیں بلکہ کسی اقتدارِ بالادست کی طرف سے بر سرِ عمل ہے۔ پھر اس کا بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حیوانات بھی لگے بندھے ضابطوں کے پابند چلے آرہے ہیں اور ان کی ارادی حرکات اس ضابطہ کو توڑ نہیں سکتیں۔ یہ سارے قوانین ایسے ہیں جنہیں مشاہدہ اور تجربہ سے مستنبط کیا جا سکتا ہے اور اسی سعی استنباط سے ہمارا علم طبیعیات، علم ادویہ، علم اعضا، اور علم افلاک اپنی موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ مگر ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر بہ جبر کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہے بلکہ مصنوعی طریقوں سے کسی ضابطہ کو انسان خود اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلو میں تجربہ و مشاہدہ کا بس نہیں چلتا اور ہم کوئی قطعی رائے کسی معاملہ میں قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

اگر طبیعیات، نباتات اور حیوانات کی زندگی کی طرح ہماری زندگی بھی مشیت یا فطرت یا کسی خارجی قوت کے پنجۂ جبر میں جکڑی ہوئی ہوتی تو تجربیت کی مدد سے ہم ایک سوال کا جواب بہت جلد نکال لیتے اور ایک سے زیادہ متضاد آرا کا چلن نہ ہوتا۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ جو اختلاف آرا اور تصادمِ افکار انسانیت کی پیدائش کے روزِ اول سے چلا تھا وہ آج تک جاری ہے۔ ہر سوال کے متعدد جوابات بیک وقت انسان کے نوعی ذہن میں پائے جاتے ہیں اور ہر جواب پر ایمان لانے والے افراد کا چھوٹا یا بڑا گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

طبیعیات کے میدان میں آپ دیکھتے ہیں کہ انسان نے جوں جوں نئی دریافتیں کیں قدیم ذرائع و وسائل حیات نابود ہوتے گئے۔ نئے آلات نے پرانے آلات کو میدان سے نکال دیا۔ نئی دریافتوں نے تمدن کی چک دمک کو ہر قدم پر زیادہ بڑھا دیا۔ کتنا نمایاں ارتقا ہے! مگر دوسری طرف تاریخ تہذیب کا غیر طبعی پہلو ملاحظہ کیجیے تو آپ یہ ماننے کے لیے مجبور ہوں گے کہ تاریخ میں ارتقا کے بجائے تکرار و اعادہ کا ثبوت ملتا ہے۔ جو گناہ انسان نے ایک دفعہ سیکھا ہے وہ پھر اس کی نوع کی زندگی کا ایک مستقل باب بن گیا ہے اور کچھ نہ کچھ انسان ہمیشہ اس کے علمبردار رہے ہیں، اسی طرح جو نیکی ایک دفعہ ایجاد ہوئی ہے وہ یکے بعد دیگرے انسانی نسلوں کی اجتماعی ذہنیتوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس کی شہادت اگر آپ چاہیں تو انسانی تہذیب و اخلاق کی تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے بکھری پڑی ہے۔

بطور مثال ناجائز معاشی استفاع کو لیجیے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی ہر شکل کو دنیا کے ہر الہامی اور عقلی مذہب کے علمبردار نفرت سے دیکھتے رہے ہیں اور شاید اسے اضافی نیکی کی حیثیت دینے پر بھی کوئی تیار نہ ہوگا۔ یہ برائی انسان کے دورِ وحشت میں چھینا جھپٹی کی شکل میں بر سرِ عمل تھی اور اس کے لیے جسمانی طاقت سب سے بڑا ہتھیار تھی۔ پھر جب سوسائٹی نے ادارۂ حکومت کو مکمل کر لیا اور مذہب نے اخلاقیات کو مستحکم بنا دیا تو اس نے ایک دوسری راہ پیدا کر لی یعنی علانیہ لوٹ مار میں جب رکاوٹیں پیدا ہوگئیں تو چوری چکاری اور نقب زنی کا فن ایجاد ہوا لیکن اس فن سے استفادہ کرنا بھی ضعیف البنیہ لوگوں کے لیے مشکل تھا اور پکڑے جانے کی شکل میں قانونی عقوبتوں اور رائے عامہ کی نفرین کی وجہ سے لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ لہٰذا اس فن کو اور ترقی ہوئی اور جوئے اور سود کے طریقے ایجاد ہوئے جو قانون کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک سکتے تھے۔ پھر جب بینک وجود میں آئی تو "سرمایہ" وسیلہ کاربن گیا۔ اب تاریخ کی اس حرکت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مطالعہ کرنے والا شخص ذرائع اور وسائل کار میں تو ضرور ارتقار دیکھے گا مگر ان ذرائع و وسائل سے کام لینے والی ظالمانہ خواہش ہر دور میں ایک ہی پائی جائے گی، اس میں سر مو فرق نہ ہوگا۔ ذرائع و وسائل کے اس ارتقار سے دھوکا کھا کر ایک سطحی بین شخص ضرور یہ دعویٰ کر بیٹھے گا کہ تہذیب ارتقار کر رہی ہے مگر درحقیقت تہذیب کا یہ ارتقار صرف طبیعی پہلو سے ہے، اخلاقی پہلو کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ اخلاق کے اعتبار سے نوع انسانی کا ایک حصہ جس پستی میں آج سے چھ ہزار برس پہلے گرا ہوا تھا اسی میں آج بھی گرا ہوا ہے۔ آج بھی ناجائز معاشی انتفاع کی خواہش کا شیطان بدستور برسر کار ہے اور اس نے انسانی عقل کی مدد سے معاشی مظالم کو مہذب پیرایہ میں جاری رکھنے کے لیے بنکنگ سسٹم کے رنگین جال پھیلا دیے ہیں جن کے ٹھاٹھ دیکھ کر ایک عامی یہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید یہ ادارے تہذیبی ارتقار کی ٹھوس شہادت ہیں۔

پھر سیاسی کبریائی کے عظیم الشان گناہ کو لیجیے۔ اس کے متعلق بھی ہر شخص خواہ خدا پرست ہو یا دہریہ، یہ متفقہ رائے رکھتا ہے کہ کسی انسانی فرد یا گروہ کو دوسرے انسانوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے کا حق نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری تہذیب برسوں کے ارتقار کے بعد بھی کیا اس شیطان کو میدانِ حیات سے خارج کر سکی ہے؟ جواب نفی میں ہے! بالکل ابتدائی دورِ مدنیت میں اس کا معصوم آغاز قبائلی کبریائی سے ہوا۔ یعنی جو قبیلہ مضبوط اور کثیر افراد پر مشتمل ہوتا تھا وہ دوسرے قبیلوں کو مسخر کر لیتا تھا۔ پھر جب بادشاہت جمانے کے فن میں ترقی ہوئی تو ملک فتح کرنا لازمۂ شاہی بن گیا۔ اسکندر، نپولین، اور چنگیز و ہلاکو اسی سیاسی خداوندی کی مے کے متوالے تھے۔ موجودہ دور میں یہ بلا بلائے بے درماں ہو گئی ہے اور قوموں پر قوموں کی شہنشاہیت مسلط ہے۔

اس برائی کی تاریخ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے تو حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ایک دور جسمانی قوت کا تھا اور اس دور میں اچھا جسم رکھنے والا فرد دوسرے افراد پر اقتدار جما لیتا تھا۔ پھر اوزاروں کے استعمال کی مہارت ذریعۂ اقتدار بنی۔ پھر بتخانوں کی مجاوری اور عبادت گاہوں کی پروہتی اور کہانت و فال گیری خدائی کا وسیلہ ٹھیری۔ پھر جاگیرداری استکبار کا ذریعہ قرار پائی۔ پھر سرمایہ داری اور ساہوکاری علو کا زینہ بنی۔ پھر دماغ کی تیز فعالیت بڑائی کی شاہ راہ بنی۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت کا ادارہ بھی ناخدا شناس سوسائٹیوں میں اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جب تک شہنشاہیت کا دور جاری رہا بادشاہ اور اس کے درباری اور حکومت کے کل پرزے سیاسی خدائی کے حصہ دار رہے۔ پھر جب دورِ جمہوریت کا آغاز ہوا تو اکثریت رکھنے والی پارٹیوں اور طبقوں نے کوس لمن الملک بجانا شروع کیا۔ پھر اسی جمہوریت سے یک جماعتی ریاست (One party state) کا تصور برآمد ہوا اور ایک جماعت نے ماغی اور مادی طاقت کے بل پر استبداد کا علم بلند کیا (اس کی مثال روس اور جرمنی کا سیاسی نظام ہے)۔ اب غور کیجیے، کیا ارتقار اس معنی میں ہوا ہے کہ انسان برائی سے بھاگ کر اچھائی کی طرف بڑھا ہے، یا اس معنی میں کہ برائی کی اصل روح کو برقرار رکھ کر برائی کے طریقوں کو ترقی دی گئی ہے؟

برطانیہ میں سرمایہ داروں کی جو قوت حکمراں ہے وہ اس حق کے بل پر حکمراں نہیں ہے۔ بلکہ محض عیاری کے زور سے حکمراں ہے۔ جرمنی میں نازی اقتدار کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اس سے بہتر کوئی اقتدار ہو نہیں سکتا، اس کی بنیاد اس سخت گیری پر ہے جس نے پوری قوم کو ایک شکنجے میں جکڑ دیا ہے۔ روس میں مزدوروں کی پارٹی ڈکٹیٹر شپ اس وجہ سے نہیں چل رہی ہے کہ وہ فطرت کو محبوب ہے، بلکہ اس کے بقا کا راز وہ تشدد آمیز نظام ہے جس نے دماغوں کو، زبان و قلم کو اور عام جسمانی طاقتوں کو قانونیت میں بالکل کس دیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ ہمارے سیاسی نظام اپنی خارجی شکلوں کے لحاظ سے کتنے ہی چمکدار کیوں نہ ہوں ان کے اندر "استبداد" کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہی "اژدہا" ناچ رہی ہے جس کی ہر جنبش کی فیس "دشمن" انسانی خون ہے۔ پھر یہ سب کچھ دیکھ کر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء ہو رہا ہے۔ اور آگے بڑھیے! تعصب کو ہر انسان برا کہے گا اور کہتا رہا ہے، مگر یہ بلا اول روز سے آج تک انسان کی جان کی لاگو ہے۔ پہلے تعصب شاید زیادہ تر مذہبی مسلکوں کی حد تک کام کرتا تھا، مگر اب فلسفوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ آج کے آزاد خیالوں کو ٹٹول کر دیکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں عصرِ رواں کے خیالات کے حق میں شدید تعصب کارفرما ہے۔ مغرب مشرق کے باشندوں کے خلاف تعصب سے کام لیتا ہے، سفید فام آدمی رنگین جلد والی اقوام کے خلاف تعصب رکھتا ہے، ہر قوم دوسری قوم کے خلاف، ہر طبقہ دوسرے طبقہ کے خلاف، ہر سیاسی پارٹی دوسری سیاسی پارٹیوں کے خلاف شعوری یا نیم شعوری طور پر تعصب سے کام لیتی ہے۔ تہذیب اگر ارتقاء کر رہی ہے تو ہزاروں سال کی کوششیں ایسی ہی ایک افتادہ برائی کا خاتمہ کیوں نہیں کر سکیں؟

انتہا پسندی صریحاً ایک برائی نظر آئے گی، مگر یہ جب ایجاد ہو گئی تو اب اس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ واقعات کا یک رخا مطالعہ برا ہے، مگر یہ انسانی ذہنیت کا عام مرض ہے۔ اسباب و علل سے اپنے حسبِ خواہش نتائج اخذ کرنے کی عادت بہت مضر ہے، مگر آدمیت اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ جھوٹ نہ مٹ سکا، وعدہ خلافی ابھی تک باقی ہے، شراب نوشی جیسی مسلّمہ برائی بحال ہے، فریب دہی جیسی اخلاقی بیماری دب دب کر ابھرتی ہے۔ پھر کیا اسی کا نام تہذیبی ارتقاء ہے؟

اس بحث کا مدعا یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ انسان "کتابِ مقدس" کے منشا کے مطابق "پیدائشی گناہگار" ہے اور اس کے پاس برائی ہی برائی ہے اور کچھ نہیں۔ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ نیکی اور بدی دونوں قسم کے محرکات سے مرکب ہے۔ اس میں کچھ رجحانات ایسے ہیں جو اسے ذاتی خواہش کا پرستار بنانے کے لیے برسرِ عمل رہتے ہیں اور کچھ ایسے داعیات ہیں جو اسے دوسرے ابنائے نوع کے مفاد کا لحاظ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ بیک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک ہیئتِ اجتماعیہ کا عضو بھی۔ یہ دونوں قسم کے محرکات ہر زمانہ میں برسرِ عمل رہتے ہیں اور ان میں تصادم جاری رہتا ہے اور انھیں کے زور کرنے سے کبھی تہذیب آگے کو حرکت کرتی ہے اور کبھی پیچھے کو۔ طبعی اسباب و وسائل کے لحاظ سے تمدن کی تاریخ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے، لیکن ان اسباب سے کام لینے میں جن مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور جن اصولوں کو اختیار کیا جاتا ہے وہ روحی اعتبار سے مختلف ادوار میں یکساں رہتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے تہذیبی ارتقاء کے داعیوں نے نظرانداز کر دیا اور غلط بنیادوں پر علوم کی تشکیل کر ڈالی۔

حیات کی مجبورانہ حرکت

ہمارے علمائے عمرانیات نے انسان کی ثقافتی زندگی سے جو دوسرا اصول اخذ کیا وہ یہ تھا کہ تہذیبی ارتقاء کا تسلسل انسان کی شعوری خواہش کے بغیر بحال رہتا ہے کیونکہ عضویاتی زندگی کی طرح ہماری تہذیبی زندگی بھی طبعی نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور یہی طبعی نظام اپنے اصولوں کے ماتحت ہمیں ایک لگے بندھے راستہ پر لیے جا رہا ہے۔ یہاں پھر ایک عظیم الشان غلطی کر ڈالی گئی۔ انسان کو عام موجودات اور خصوصاً حیوانات سے ممتاز نہ سمجھنے کی وجہ سے موجودہ فلسفۂ تمدن نے یہ ٹھوکر کھائی کہ جس صورتِ حال کو طبعی، نباتاتی، اور حیوانی دنیاؤں میں کارفرما دیکھا اسی کو انسان پر بھی چسپاں کر دیا۔ کارخانۂ طبیعت پورے کا پورا ارتقاء کر رہا ہے اور بغیر کسی نمایاں خواہش کے ارتقاء کر رہا ہے۔ اس میں نباتات اور حیوانات سب برابر کے شریک ہیں۔ سب اپنے کسی ارادہ کے بغیر مشیت کے دھکیلنے سے اصلیت کی راہ پر بڑھ رہے ہیں، اس لیے یہ فرض کیا گیا کہ انسان بھی مشیت کے دباؤ سے ارتقاء کر رہا ہے۔

دراصل اس معاملہ میں مفکرینِ عہدِ جدید کی کوتاہی یہ تھی کہ وہ "شعور و اختیار" کی اس سرحدی لکیر کو نہ سمجھ سکے جسے پھاند کر زندگی جداگانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسم کے حالات میں آ داخل ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے شعور و اختیار کو بالکل وہی حیثیت دی جو شیر کے لیے پنجوں کی ہے اور ہاتھی کے لیے سونڈ کی۔ ان کے لیے اس کے سوا دراصل چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ کائنات کے مطالعہ میں اول قدم پر ہی ایک ایسی غلطی کر آئے تھے جس سے غلطی در غلطی کی ایک مسلسل نسل کا چل نکلنا ناگزیر تھا۔ ان کی تحقیق کا فیصلہ یہ تھا کہ کائنات کے پس پردہ کوئی "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" شعور برسر عمل ہے ہی نہیں؛ یہ جو شعور کے آثار نظر آتے ہیں یہ سب کچھ مادہ و قوت کی اندھی فطرت کا کرشمہ ہے۔ بدیں وجہ انسان کے شعور کی اصل قیمت کا اندازہ ان کو نہ ہو سکا۔ حالانکہ مادہ و قوت کے اندھے پن سے ایک منضبط پیچیدہ نظم کو ارتقاء کی راہ پر ہمواری سے چلانے کا تخیل بالکل احمقانہ ہے۔ اگر خدا کے نام کے خلاف ان میں انتہائی تعصب موجود نہ ہوتا تو یہ حضرات بلا تامل تسلیم کر لیتے کہ مادہ کی مشینری جو قوت کی اسٹیم سے چل رہی ہے، اپنے پیچھے ایک ذی شعور موجد اور ڈرائیور رکھتی ہے۔ اس کی مشیت جو اندھی نہیں بلکہ سوانکھی ہے وہی بے جان عناصر کو گھسیٹ کر نباتات کی منزل پر لائی، پھر اس منزل سے آگے بڑھ کر اس نے حیوانات کا عظیم الشان چڑیا گھر سجایا پھر وہی زندگی کو دھکیلتی ہوئی انسانیت کی منزل پر پہنچا گئی جو کائنات کے مرکزی شعور کا بہترین اور آخری پیرایۂ ظہور ہے۔ یہ جو مشیت نے وجود کو شعور جلی کے مقام پر پہنچایا ہے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وجود کو دھکیل کر آگے چلانے کے بجائے اسے بطور خود حرکت کرنے کے قابل بنایا جائے اور اسے ارتقا کی راہ پر بڑھنے کے لیے خارجی ہدایات کا حاصل ہو جانا کافی ہو۔ دوسرے لفظوں میں وجود کو مشین کی سطح سے اٹھا کر نائب کارندے کی سطح پر لایا گیا۔ پہلے وجود صرف موٹر گاڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ڈرائیونگ فطرت کے ذمہ تھی، اب وجود کی ڈرائیونگ خود وجود کے شعور کی طرف منتقل ہو گئی اور فطرت کا کام یہ رہ گیا کہ وہ ڈرائیور کو اپنی سلطنت کی ٹیڑھی سیدھی راہوں کا پتہ دے اور ارتقا کی راہ کی خارجی حد بندی کر دے۔ اسی خارجی رہبری کے لیے صاحب فطرت کی طرف سے سلسلۂ الہام و نبوت کا اجرا ہوا۔ مذہب کے احکام راہ ارتقاء کے دو طرفہ سرحدی نشانات اور علامات کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

شاید یہ کہا جائے گا کہ انسان جب شعور رکھتا ہے تو اس کو خارجی رہبری کی احتیاج ہی کیا ہے، خارجی ہدایت کی پابندی تو آزادی کی اس خواہش کے خلاف ہے جو شعور کے لازمی حیثیت سے آدمی کی ذہنیت میں کام کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں اوپر والی مثال ہی کافی ہے۔ اگر ایک مشین کا صانع اور مالک اس کے صحیح استعمال کے لیے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیتا ہے تو یہ ڈرائیور کی آزادی سلب کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی سڑک کو نشانات سے محدود کر دیا جاتا ہے تو اسے مسافر کی آزادی میں مداخلت بے جا نہیں کہا جا سکتا۔ آزادی کو تصادم کی آزادی اور کھڈ میں جا گرنے کی آزادی کا ہم معنی سمجھنا محض ایک حماقت ہے۔ اگر کوئی مسافر رہنمائی کو اپنے شعور و اختیار کی توہین سمجھے اور اصرار کرے کہ میں اپنا راستہ خود بناؤں گا تو مختلف سمتوں پر سفر کا تجربہ کرنے اور بہترین شاہ راہ کو تلاش کرنے میں اس کی پوری عمر صرف ہو جائے گی۔ یہی حال نوع انسانی کا ہے۔ یہ مسافر صدیوں کی کوشش کے بعد بھی نہ تو اس نظام عالم کو سمجھ سکا ہے جس میں یہ سانس لے رہا ہے، نہ خود اپنے آپ کو سمجھا ہے، نہ اپنے تمدن کے بنیادی مسائل کو سمجھا ہے اور نہ مختلف تہذیبی اصولوں کی آزمائش سے فارغ ہوا ہے۔ کیونکہ ایک ایک تہذیبی اصول کی آزمائش صدیوں کی مہلت چاہتی ہے۔ شاید ہماری نوعی زندگی کی پوری مہلت گذر جانے پر ہمارا شعور ان اسرار سے پورے طور پر واقف ہو جائے جو تمدن کی گاڑی کو ارتقاء کی راہ پر بڑھائے جانے کے لیے ضروری ہیں۔

بہر حال ہمارا مدعا یہ عرض کرنا ہے کہ علمائے عمرانیات نے شعور کی ذمہ داری کو نہ سمجھا۔ شعور کے ہونے کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ آدمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر خیر اور شر دونوں قسم کی شاہراہیں کھل گئی ہیں اور وہ دونوں پر گامزن کرتا چلا آرہا ہے۔ ورنہ اگر فی الواقع ارتقا کا تسلسل غیر منقطع ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "شر" ہماری زندگی میں ہے ہی نہیں۔ اگر "شر" نہیں ہے تو "خیر" کا تصور بھی ناممکن ہے۔ پھر ان دونوں تصورات کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس رہ کیا جاتا ہے اور آپ شعور کا دعویٰ ہی کس بنا پر کرتے ہیں؟

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ آدمی خیر اور شر دونوں پر قادر ہے اور ان میں سے کسی ایک رویہ کو انتخاب کرنے کی آزادی بھی رکھتا ہے، یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے کہ تہذیبِ انسانی میں لازماً ارتقا ہی ارتقا نہیں بلکہ تنزل بھی ہے اور یہ ارتقا جبری نہیں بلکہ ارادی ہے۔ جب کبھی انسان اپنے رویّہ کو خیر کے سانچے میں ڈھالے گا تو ارتقا ہوگا اور جب اس کی زندگی کی سوئی "شر" کی سمت میں گھوم جائے گی تو تہذیبی انحطاط کا دور شروع ہو جائے گا۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی و طبقاتی، قومی اعمال ہوں یا نوعی، ان سب پر یہی اصول حاوی ہے۔

یہ واقعہ مسلّم ہے کہ آدمی حیوانی اور انسانی، انفرادی اور اجتماعی، انتہا پسندانہ اور معتدلانہ، عقلی اور جذباتی، دوہری قوتوں سے مسلح ہے اور دونوں قسم کی قوتوں کو تحریک دینے والے لاتعداد محرکات زور کرتے رہتے ہیں۔ ایک نوعیت کی قوتیں ابھرتی ہیں تو حیات کی حرکت اپنی فطری سمت میں جاری ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب دوسری نوعیت کے خارجی محرکات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو دوسری نوعیت کی ذہنی قوتیں سطح پر آجاتی ہیں اور حیات کی حرکت ایک دوسری سمت میں ہونے لگتی ہے۔ زندگی کی اس دوسمتی حرکت کے ساتھ طبیعی میدان میں ارتقا جاری رہتا ہے۔ مگر ماحول کے اس گہرے اثر کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں جبریت کارفرما ہے۔ نہیں! اس ظاہری جبریت کے ساتھ ساتھ انسان کا ارادہ بھی تہذیبی اور اخلاقی اعمال کی تشکیل میں شامل رہتا ہے۔ آدمی اگر پوری طرح اپنے آپ کو ماحول کے پنجے میں دیتا ہے تو بھی اپنی قوتِ ارادی کی بنا پر اور اگر وہ ماحول پر غالب آنے کے لیے اپنے آپ کو بعض اصولوں کا پابند بناتا ہے تو بھی اپنے انتخاب سے۔ یہ ارادہ و انتخاب اس کی تہذیبی کارگزاریوں کی پوری ذمہ داری خود اسی پر ڈال دیتا ہے۔

ہماری نوعی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے متضاد فکری عوامل رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ ہر تمدنی دور میں کچھ انسان ایک قسم کے عوامل کی گرفت میں کام کرتے ہیں اور کچھ دوسری قسم کے عوامل کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ بعض "خیر" کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور بعض "شر" کی طرف، اور عقل بلا امتیاز دونوں گروہوں کو رنگا رنگ وسائل کار فراہم کرکے دیتی رہتی ہے۔ جو انسانی گروہ زیادہ وسائل کار اور قوتِ کارکردگی حاصل کر لیتا ہے وہ اونچا اٹھ جاتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی تہذیب، اس کی سیاست، اس کے اخلاق، اس کے علوم و فنون فضا پر قبضہ کر لیتے ہیں، مگر دوسرے عوامل اندر اندر زور کرتے رہتے ہیں اور آخرکار جب انھیں انقلاب اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے تو باطل ان کے قبضہ میں آجاتی ہے۔ گویا طبعی ارتقا کے بالمقابل اخلاقیاتی اور تہذیبی تکرار کا عمل جاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری تہذیبی حرکت مسلسل اور ایک رخی نہیں ہے، یہ حرکت لنگر کی سی حرکت ہے اور اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک انسانی شعور پر ہے۔ (باقی)

خطبات

عرصہ سے یہ کتاب ختم تھی۔ اب دوبارہ چھپ کر ہمارے مکتبہ میں آگئی ہے۔ ضرورتمند حضرات کے لیے اطلاعاً عرض ہے۔ قیمت عہ

پتہ: منیجر مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام۔ پٹھانکوٹ

© rasailojaraid.com